Sociology & Cultural Research Review (SCRR)
Available Online: https://scrrjournal.com
Print ISSN: 3007-3103 Online ISSN: 3007-3111
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

"Gadriya" by Ashfaq Ahmad: A Symbol of Humanism and Enlightenment

"گڈریا" از اشفاق احمد: انسان دوستی اور روشن خیالی کی علامت

Syed Fakhar Imam Shah
Lecturer, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalnagar Campus
Tanzeela Qurban
MPhil Scholar, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalnagar Campus
Israr Ahmad
Lecturer, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalnagar Campus

ABSTRACT

A human being takes certain traits and characteristics in his instinct and opens his eyes under the shadow of certain customs and traditions in this society. Among the best qualities that have been counted among them are the feelings of mercy, mutual compassion and love, self-sacrifice and philanthropy. In all of them, philanthropy is a trait that is distinguished by religion, color, caste and nationality. Ashfaq Ahmed has also presented many such creations in Urdu literature which reflect the universality.His short story "Gadriya" covers the subject of migration and riots, it also reflects enlightenment and philanthropy in a rich way.

***Keywords**: Popular Literature, Pure Literature, Philanthropy, Enlightenment, Gadriya.*

ملخص:

انسان اپنی جبلّت میں مخصوص اطوار وخصائل لے کر اس معاشرے میں مخصوص رسوم ورواج کے زیر سایہ آنکھ کھولتا ہے۔ جو عمدہ ترین اطور وخصائل شمار کیے جاتے ہیں ان میں سے صلہ رحمی، باہمی شفقت ومحبت، ایثار وقربانی اور انسان دوستی جیسے جذبے شامل ہیں۔ ان سب میں انسان دوستی ایک ایسی خصلت ہے جو مذہب، رنگ، نسل اور قومیت سے ممتاز ہے۔ دنیا میں جتنے بھی ادیب عرق ریزی وعمیق نظری کے بعد جب اپنی تخلیقات کی کھیتی کو خون سے سیر اب کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو یہ امر سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے کہ یہ ادب اپنے اندر عالمگیریت رکھتا ہے یا نہیں۔ انسان دوستی اور روشن خیالی دو ایسی خصلتیں ہیں جو کہ کسی ادیب کو عالم گیر سطح پر ممیّز وممتاز کرتی ہیں۔ اشفاق احمد بھی اردو ادب میں ایسی بہت سی تخلیقات پیش کر چکے ہیں جن میں عالم گیریت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کا افسانہ "گڈریا" جہاں ہجرت اور فسادات کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے وہیں اس میں روشن خیالی اور انسان دوستی کی عکاسی بھی بھرپور انداز سے نظر آتی ہے۔

کلیدی الفاظ: مقبول ادب، ادبِ عالیہ، عوام دوستی، انسان دوستی، روشن خیالی، گڈریا

ادب میں کسی مخصوص زبان، قوم، رنگ، نسل، مذہب، وطن یا خطے کی نمائندگی کا رویہ اپنانا "مقبول ادب" جبکہ اِس طرح کے تیار شدہ یا مختص کیے ہوئے دائرے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف انسان کی نمائندگی کرنا "ادبِ عالیہ " کہلاتا ہے۔ ادب کا اوّل الذکر تصوّر "عوام دوست" جبکہ موٴخر الذکر نظریہ "انسان دوست" تسلیم کیا جاتا ہے۔ عوام دوست ادب میں سماجی نمود و نمائش میں چُور ہونے کے ڈھونگ رچائے جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں جبکہ انسان دوست ادب میں سماج کی مٹتی ہوئی اخلاقی قدر کا تحفّظ اور انسان کی لٹتی ہوئی آبرو کی فکر کار فرما ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں عوام دوست ادب "آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا" کے مصداق ہوتا ہے جبکہ انسان دوست ادب "فرشتے سے بہتر ہے انساں بننا" کا درس دیتا ہے۔ بنیادی طور پر انسان ہی ادب کا اصلی محرک ہے اور ادب میں انسان دوستی کا مطلب انسان سے محبّت کرنا اور بنیادی انسانی حقوق کی ترجمانی کرنا ہے۔ یہاں تک کہ تمام مناصبِ ادب (تخلیق، تنقید، تحقیق و تدوین اور تاریخ) کا مقصود بھی خدمتِ انسانیت کو مقصدِ حیات بناتے ہوئے انسان دوستی کو فروغ دینا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سچّا ادب یا ادبِ عالیہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہنے کا نام ہے۔ کیوں کہ

"سچّا ادب معاشرے کی مکمل تشکیلِ نو کا کام ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانی جذبے اپنی پوتر اور پاک حالت میں ہوں۔" [1]

مقبول یعنی عوام دوست ادب عموماً قدامت پسند، رجعت پرست اور دقیانوسی سوچ کا عکاس ہوتا ہے جبکہ ادبِ عالیہ یعنی انسان دوست ادب میں نظریاتی ردوبدل، مکالمہ اور دوسروں کے عقائد و نظریات کا احترام کرنے کی صفات پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں عوام دوست ادب میں توہم پرستی، مذہبی شدّت پسندی اور عدم برداشت کے جذبات کی بھرمار ہوتی ہے جبکہ انسان دوست ادب میں برداشت کے ساتھ دوسروں کی آراء سننے اور اپنے رویّوں میں لچک پیدا کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔ ایسا ادب جس میں دوسروں کی بات سننے، اُن کے عقائد و نظریات اور آراء کا احترام کرنے، مکالمہ کرنے اور نئے نئے خیالات کو قبول کرنے کی اہلیت ہو "روشن خیال" فکر ہونے کا درجہ رکھتا ہے۔ اِس طرزِ فکر کے ادب میں مختلف علوم سے حاصل ہونے والا گہرا تفکر اور علمی و ادبی بصیرت درکار ہوتی ہے۔

"مختصر یہ کہ روشن خیالی کا ہر پہلو خواہ اُس کا تعلق کسی بھی شعبۂ حیات سے ہو، فکر و دانش اور عمل و اجتہاد سے مشروط ہے اور جو قومیں، اِن شرائط کو پورا کرتی ہیں وہی دنیا میں احترام، اعزاز اور پاسبانی و حکمرانی کی مستحق ہوتی ہیں۔" [2]

اشفاق احمد کی ادبی جہات کا محبوب ترین موضوع تصوّف ہے جس (تصوّف) کی بنیاد وہ خیر و شر پر رکھتے ہیں۔ خیر اُن کے نزدیک ہر وہ عمل ہے جس سے بلا امتیاز ہر انسان کو فائدہ حاصل ہو۔ جو کل نوعِ انسانی کو مذہبی شدّت پسندی، فرقہ واریت، قوم پرستی، نسلی تفاخر اور لسانی تعصّب کی بنیاد پر تقسیم نہ کرے بلکہ ہر قسم اور نوعیّت کی تفریق کو پسِ پشت ڈال کر فرد کو انفرادی شناخت کے بجائے اجتماعی شناخت کے دائرے میں داخل کردے۔ شر اُن کے نزدیک ہر وہ عمل ہے جس سے انسانی وجود کی ناقدری یا انسانی وجود کی بے معنویت کی بُو آتی ہو۔ تاہم اُن کی ادبی تحاریر کے مطابق خیر ہی وہ واحد سبو ہے جو محبّت کے جام

سے شر کی آگ کو بجھا سکتا ہے۔ اشفاق احمد کی تخلیقات میں اِس طرح کی خیر سگالی اور منطقی سوچ کا عَلَم روشن ہونا نہ صرف اُن کے انسان دوست اور روشن خیال ہونے کی علامت ہے بلکہ ادب کے جدید رجحانات کی طرف رجوع کرنے کی عملی دلیل بھی ہے۔ اِس حوالے سے جب اُن کے افسانہ ”گڈریا“ کا مطالعہ کرتے ہیں تو فرد کی قوم، نسل، زبان یہاں تک کہ مذہب کا پرتو بھی ”انسانیت“ کے روپ میں نمایاں ہوتا ہے۔ جس کا منھ بولتا ثبوت ہندو مسلم اتحاد ہے جو انسان کی اجتماعی شناخت کی علامت ہے۔

” افسانہ گڈریا نہ صرف انسان دوستی کی بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنا تہذیب کی علامت ہے۔“ [3]

اشفاق احمد نے اِس افسانے میں جہاں انسانی ہمدردی کو ثوابِ دارین سے منسوب کرتے ہوئے انسان دوستی کا پیغام دیا ہے وہاں سماجی جکڑ بندی اور مذہبی شدّت پسندی کے بجائے انسانی اتحاد کو افضل عبادت کا درجہ دیتے ہوئے روشن خیالی کا عملی مظاہرہ پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے جس کی لفظی تصویری جھلک درج ذیل اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

” انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا۔ ”لے بھائی طنبورے، میں تو یوں نہ سمجھا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔“ پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے گئے۔ بستر میں بٹھا کر انھوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔“ [4]

جدیدیت کی رو سے ادب کا محرک انسان اور اُس کی ہفت پہلو زندگی ہے۔ اِس لیے عصری ادب کو انسانی ذات کی آزادی اور اُس کے وجودی اظہار کا ضامن ہونا چاہیے۔ اِس حوالے سے ”وجودیت“ کی تحریک اِس طرح کے ادب کا معتبر حوالہ اور دستاویز بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ایک ایسی فکری تحریک ہے جس کا تعلق انسانی وجود کے جذباتی پہلو اور اقداری مسائل سے ہے۔ چنانچہ اشفاق احمد کے افسانے ”گڈریا“ میں جذبات کی آڑ میں آ کر کمائی جانے والی انسانی وجود کی مصنوعی شہرت کو یکسر مسترد کر کے دکھایا تو گیا ہے لیکن فرد کے وجودی تصوّر کو بحال رکھنے کے لیے اُس کے حقیقی تشخص کو مٹنے نہیں دیا گیا۔ یہاں تک کہ اِس افسانے میں اِس طرح کے اقداری مسئلے کو دانش مندی سے حل کرنے کا اخلاقی پہلو اِس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ انسان کی شہرت اور نیک نامی اُس کی علمی بصیرت سے ہے۔

”مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی۔“ میں نے گستاخی سے بات کاٹ دی۔

”تو اور کیا ہو گا گولو؟“ اُنھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا ”میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا۔ پھر دیکھنا——“ اب کے داؤ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبّت سے کہا۔ خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک اَن پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا۔ نہ ڈاکٹر صاحب۔“ [5]

جدیدیت کے عہد میں نمو پانے والی ایک اور اہم تحریک کا نام ”سرئیلزم“ ہے جس کا بنیادی سروکار تخلیق کار کی لاشعوری فکر سے ہے۔ یہ تحریک ایسی براہِ راست تحریر (Automatic Writing) کو سامنے لانا چاہتی ہے جو شعور اور لاشعور کی حدود کو

توڑدے۔اِس تحریک کے مطابق تخلیق کار کسی بھی سماجی پابندی کا قائل نہیں اور نہ ہی شعوری طور پر وہ کسی مہا بیانے کا پیروکار ہے۔ وہ صرف انسان کا نمائندہ ہے۔اِسی لیے وہ اپنے فکری بیانیے کو سماج تک پہنچانے کے لیے مختارِ کل ہے۔اِس حوالے سے تخلیق کار کو چاہیے کہ وہ اپنے لاشعور کا بے دریغ استعمال کرے تاکہ اُس کی شخصیت اور فکر کا ہر پہلو واضح ہو جائے۔اشفاق احمد کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کے افسانے"گڈریا" میں لاشعوری تمنائیوں کا بے دریغ استعمال کیا گیا ہے۔بنیادی طور پر یہ تمنالیاں افسانہ نگار کے وہ لاشعوری خیالات ہیں جنھیں وہ اِس افسانے میں حقیقی تکمیل کا روپ دینا چاہتے ہیں۔مثلاً"داوٌجی" جو کہ اِس افسانے کا مرکزی کردار ہے کا"گولو"کو ایک پڑھے لکھے کامیاب انسان میں دیکھنے کی خواہش،اپنے معذور استاد"اسماعیل چشتی" کو اپنی ٹانگوں کی حرارت نذرانے کے طور پر دینے کی حسرت،گولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھنے کی آرزو اور خاص طور پر ہندو مسلم اتحاد کی تمنّا جس کے ٹوٹنے کے خدشے کا اظہار وہ اپنے حقیقی بیٹے"امی چند"کے برے خیالات کی صورت میں یوں کرتا ہے۔

" اُس کے خیالات کچھ مجھے اچھّے نہیں لگتے۔یہ سیوانگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔میری تو وہ کب مانے گا،ہاں خدائے بزرگ وبرتر اُس کو ایک نیک مومن بیوی دلا دے تو وہ اُسے راہِ راست پر لے آئے گی۔" [6]

سیکولر معاشروں کا فلسفہ ہے کہ فرد اور معاشرے کے درمیان تعلق کی بنیاد عمرانی اصولوں کے تحت رکھی گئی ہے۔اِس لیے کائنات میں موجود چیزوں کا اعتبار اندھی تقلید اور مذہبی توہم پرستی کے بجائے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر کیا جائے۔یعنی تمام موجودہ مظاہر کی سچّائی کو روایتی فلسفے کی من وعن پیروی کرنے کے بجائے تعقلی فلسفے کی بنیاد پر ثابت کیا جائے۔لہٰذا سیکولر سوچ رکھنے والے ادیبوں کے مطابق عصری ادب کی نوعیّت بھی عمرانی ہونی چاہیے جو قاری کی ذہنی سطح کو سائنسی اور قطعی علم کی بنیاد پر شعوری بیداری دے۔اِس تناظر میں جب ہم مطالعہ طلب افسانہ" گڈریا" کے مرکزی کردار"چنت رام"المعروف بہ داوٌجی کی سوچ کا احاطہ کرتے ہیں تو افسانہ نگار میں ایک سیکولر فرد کے عمرانی مزاج شناس ہونے کا ادراک ملتا ہے۔جس کے علم کی منتقلی کا مقصود ضعیف الاعتقادی کو مٹانا اور مسلّمہ تقاضوں کے مطابق ذہن سازی کرنا ہے۔

" تو احمق ہے اور تیری بے بے اُمّ الجاہلین۔۔۔۔۔۔میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔افسوس۔۔۔۔۔۔صد افسوس۔" [7]

فطری مظاہر کے مادی و غیر مادی وجود کو جدید سائنسی علوم کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا عصری شعور بھی اِس افسانے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اِس حوالے سے داوٌجی کے گھر میں"رانو"جو کہ پیشے کے اعتبار سے ایک گڈریا ہے کی بھونڈی شرارت کی وجہ سے اینٹوں کا آنا،"بے بے"جو کہ داوٌجی کی زوجہ بھی ہے کا اجتماعی لاشعور کی بنیاد پر خوف کی صورت میں جنّوں بھوتوں کے غیر مادی وجود کو ماننا،گولو کا بے بے کی تائید کرنا اور بے بے کا اپنے شوہرِ نامدار پر کالے علم کے ذریعے اپنے ہی بیٹے امی چند کی جان

لینے کا الزام لگانا بے بنیاد، غیر منطقی اور دقیانوسی سوچ کی عکاسی ہے۔ جبکہ گولو کا جن بھوت اور چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھنے پر داؤجی کا ہنسنا اور اُس پر طبعی دلیل دینا افسانہ نگار کے سائنسی اور قطعی شعور کی طرف اشارہ ہے۔

"داؤجی نے کہا۔ تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا، اِس لیے نہ وہ ہے نہ اُس سے اینٹ اُٹھائی جاسکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔ پھر بولے۔ "سُن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جاسکتی ـــــ سمجھ گیا؟ [8]"

جدید نفسیاتی تحقیق کے مطابق انسان سماجی جانور (Social Animal) ہے اور وہ بھیڑ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اِس مزاج اور طبیعت کے مالک افراد بیرون بین (Extrovert) کہلاتے ہیں جو اپنی فراخ دلی اور خوش اخلاقی کے باعث محفل کی جان ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے تعلق رکھنے والے افراد بوریت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ بار بار ملنے کے اشتیاق میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی جذباتی وابستگی بعض اوقات اتنی شدّت اختیار کرجاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی دوری بھی برداشت نہیں کرپاتے۔ دیکھا جائے تو افراد میں ایسا خوش گوار ماحول انسان کی اجتماعی شناخت کی ضمانت ہے۔ اِس نوعیّت کا عملی مظاہرہ زیرِ نظر افسانہ "گڈریا" کے مرکزی کردار داؤجی کی صورت میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ واحد مثالی کردار جو افسانے کی جان ہے۔ جس سے اُس کا معذور استاد اسماعیل چشتی اتنا مانوس ہے کہ وہ اُس سے ایک برس کی طویل جدائی کے احوال یوں بیان کرتا ہے۔

"چنت رام! اگر ہم میں قوت ہو تو اِن پاؤں کو کھینچ لیں۔" اس پر میں رو دیا تو دستِ محبّت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے۔ "ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔" یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔" [9]

سماجی ضابطوں کو مذہبی شدّت پسندی کے بجائے انسان دوستی اور روشن خیالی سے جوڑنا اِس افسانے کا امتیازی وصف ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی بھی فرد کو جبری زور پر مذہب کی قبولیت پر مجبور کیا جائے اور نہ ہی اِس بات کی اجازت دیتا ہے کہ بزرگوں کی بے حرمتی کی جائے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی تقسیم بھی اِسی مذہبی شدّت پسندی کی بنیاد پر ہوئی۔ تقسیم کے دوران رانو جیسے نہ جانے کتنے تنگ نظر کرداروں نے جنم لیا ہو گا۔ جنھوں نے یا تو پہلے داؤجی جیسے شریف النفس اور نیک دل بزرگ افراد کو موت کی بھینٹ چڑھایا ہو گا یا پھر ذاتی غلام بنالیا ہو گا۔ تاہم فسادات کے حقائق جو بھی ہوں۔

"بہر طور اشفاق احمد کی خوبی یہ ہے کہ اِس قیامت کے منظر کو کسی بے رحم مصوّر کی طرح تمام رنگوں اور خطوں کی مدد سے مجسم کر دیتے ہیں۔" [10]

غور طلب بات یہ ہے کہ اِس افسانے میں افسانہ نگار نے رانو جیسے شر پسند کردار کے ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے جو مذہب کو بنیاد بنا کر سماجی جبر کے زور پر کلمہ پڑھوانے کو اسلام کی خدمت گردانتا ہے۔ جسے یہ تک معلوم نہیں کہ کلمہ کتنے ہوتے ہیں؟ جبکہ داؤجی جیسے ہندو کردار کا رانو کے ہاتھوں بودی جسے وہ اپنی ماں کی نشانی اور زندگی کی طرح عزیز سمجھتا

ہے مزاحمت کیے بغیر کٹوانا، اُس کے ننگے سر پر تھپڑ جیسی غیر اخلاقی حرکت کا ردِ عمل نہ دینا، صبر واستقامت کے ساتھ کلمہ پڑھنا اور آخر میں بے آبرو ہو کر ننگے سر بکریوں کے پیچھے چلنا اِس بات کی دلیل ہے کہ بدی کی انتہا کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہو انسان دوستی اور روشن خیالی کی عظمت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں امن سے جنم لینے والی انسانی اجتماعی شناخت کے آگے مذہب کی جبری قبولیت اور بدی سے جنم لینے والی بے حرمتی کی کوئی وقعت نہیں۔

> ”پھر اُس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کلمہ پڑھ پنڈ تا۔“ اور داؤجی آہستہ سے بولے۔ ”کونسا؟“ رانو نے اُن کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا۔ ”سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!“ جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی اُن کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ ”چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔“ اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!“ [11]

مجموعی طور پر اشفاق احمد کا افسانہ ”گڈریا“ ایک ایسے معاشرے کا استعارہ ہے جس میں نیکی اور بدی کے درمیان فرق کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اِس افسانے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے یہ فرق دو فریقین کے فکری تصادم سے ظاہر کیا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوعی تصادم ہے جس میں رانو کی تخریب کاری، شر پسندی، توہم پرستی، تفرقہ بازی اور مذہبی شدّت پسندی کے مقابلے میں داؤجی کی رواداری، صُلح پسندی، تعقّل پرستی، انسان دوستی اور روشن خیالی ہے۔ اگرچہ افسانے کے اختتام پر تقسیم کے دوران رونما ہونے والے ہندو مسلم فسادات کی آڑ میں رانو کی انتقامی آگ داؤجی کی بے توقیری کر کے خیر پر حاوی تو ہو جاتی ہے تاہم اُس پر بھی داؤجی کی مصلحت پسندی، بُردباری اور مزاحمت نہ کرنے کی دانش مندی رانو کے شر کو شکست دے کر فتح پا لیتی ہے۔ غرض سماج کو آج بھی داؤجی جیسے بیسیوں سیکولر انسانوں کی ضرورت ہے جو بے بنیاد سماجی پابندی کو انسان دوستی اور مذہبی منافرت کو روشن خیالی میں بدل دیں۔

حوالہ جات

1۔ ابنِ حسن۔ ”موجودہ ادبی صورتِ حال“ مشمولا ادب اور معروضی حقیقت (مارکسی جمالیات میں ایک مطالعہ) مرتبہ صبغت وائیں (لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2023ء) ص 563۔

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ”روشن خیالی اور اردو ادب میں اُس کی روایت“، فنون، شمارہ 31 (جنوری تا مارچ 1991ء) ص: 75۔

۳۔ شہناز، ڈاکٹر۔ ”اردو افسانے کا موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ“ (مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، راجستھان، 2017ء) ص 291۔

۴۔ اشفاق احمد۔ ”گڈریا“ مشمولا اُجلے پھول (لاہور: بُک لینڈ، 1957ء) ص 563۔

5۔ ایضاً، ص 181۔

6۔ ایضاً، ص 204۔

7۔ ایضاً،ص229،228۔

8۔ ایضاً۔ص230،229۔

9۔ ایضاً،ص224،223۔

10۔ انوار احمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،بار سوم (ملتان: کتاب نگر،2017ء)ص470۔

11۔ اشفاق احمد۔"گڈریا"،ص240،239

SCRR